علامہ اقبالؒ اور زوال و عروج ملّت اسلامیہ

ڈاکٹر محمد ریاض

"علامہ اقبال ان اکابر مفکرین اسلام میں سے ہیں جن کا تفکر فرد اور ملّت دونوں سے مربوط ہے۔ اس تفکر کو اقبال نے خودی اور بیخودی کا نام دیا ہے۔ وہ فرد کی خودی کو ملّت کی خدمت کے لئے وقف کرنے کے قائل تھے :

وجود افراد کا مجازی ہے، ہستی قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملّت پہ یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا (۱)

اقبال نے اممِ گذشتہ و حال کے زوال و عروج کے اسباب و علل پر غائر نظر ڈالی اور ملّتِ اسلامیہ کے نشیب و فراز پر فطرتاً وہ زیادہ متوجہ رہے۔ مفکرینِ اسلام میں سے کئی نے یہ کام ماضی و حال میں انجام دیا کہ زوال و عروج ملّتِ اسلامیہ کے اسباب و نتائج معلوم کریں مگر علامہ اقبال کا سا غیر مادی اور روحانی نقطۂ نظر دوسروں کے ہاں بالعموم مفقود نظر آتا ہے۔ اقبال مادی وسائل اور ظاہری اسباب کے منکر نہیں مگر انہیں روحانی اور ایمانی امور کے تابع قرار دیتے ہیں۔ ان کا تصورِ ملت بھی کتب سیاسیات کے تصورِ ملّت سے مختلف ہے۔ وہ حکومتی اقتدار کو ہی عروج نہ جانتے تھے۔ علمی اور معنوی عروج اس سے کہیں اہم تر ہے مگر دورِ زوال کے مسلمان ان دونوں قسم کی برتریوں سے محروم ہو گئے تھے :

© Dr Muhammad Hamidullah Library, IIU, Islamabad. http://iri.iiu.edu.pk/

گنوا دی ہم نے جو اسلاف سے میراث پائی تھی
ثریا سے زمیں پر آسماں نے ہم کو دے مارا
حکومت کا تو کیا رونا کہ وہ اک عارضی شے تھی
نہیں دنیا کے آئینِ مسلم سے کوئی چارا
مگر وہ علم کے موتی کتابیں اپنے آبا کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں تو دل ہوتا ہے سیپارا (۲)

قرآن مجید میں فرد کی ہی نہیں، ملت کی مدتِ حیات معین بتائی گئی ہے۔ اسی اصول کے تحت اقوام و ملل بحرِ وجود سے ابھرا بھر کے مٹتی رہی ہیں۔ علامہ اقبال ملتِ اسلامیہ کا عالمگیر زوال و انحطاط ملاحظہ کرنے کے باوجود پُرامید تھے کہ اس ملت کا حال کتنا ہی مایوس کن سہی، اس کے مستقبل کے ادوار اس کے ماضی کی طرح شاندار اور پُر عروج ہوں گے:

ہم نشیں مسلم ہوں میں، توحید کا حامل ہوں میں
اس صداقت پر ازل سے شاہد عادل ہوں میں
نبض موجودات میں پیدا حرارت اس سے ہے
اور مسلم کے تخیل میں جسارت اس سے ہے
حق نے عالم اس صداقت کے لئے پیدا کیا
اور مجھے اس کی حفاظت کے لئے پیدا کیا
قسمتِ عالم کا مسلم کوکب تابندہ ہے
جس کی تابانی سے افسونِ سحر شرمندہ ہے
آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرارِ حیات
کہہ نہیں سکتے مجھے نومید پیکارِ حیات
کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پہ مجھے
یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوشِ کارزار (۳)

یہاں اقبال نے یہ نکتہ بتایا ہے کہ امت مسلمہ خالص توحید کی حفاظت کے لئے ہمیشہ موجود رہے گی۔ اگر دنیا کے ایک گوشے میں اسے زوال آگیا تو دیگر گوشوں میں اسے عروج ملے گا کہ :

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے ادھر نکلے (۴)

مثنوی رموزِ بیخودی میں اقبال فرماتے ہیں کہ امتِ مسلمہ قرآن مجید کی حامل ہے اور چونکہ اس کتابِ اعظم کی ابدی حفاظت کا وعدہ خود خدائے تعالیٰ نے کر رکھا ہے، لہٰذا اس کتاب کے حامل دنیا سے مٹ نہیں سکتے:

فرد برمی خیزد از مشتِ گلے — قوم زاید از دلِ صاحب دلے
فرد پور شصت و ہفتاد است و بس — قوم را صد سال مثلِ یک نفس
زندہ فرد از ارتباطِ جان و تن — زندہ قوم از حفظِ ناموسِ کہن
مرگ فرد از خشکیٔ رودِ حیات — مرگِ قوم از ترکِ مقصودِ حیات
گرچہ ملت ہم بمیرد مثلِ فرد — از اجل فرمان پذیرد مثلِ فرد (۵)
امتِ مسلم ز آیاتِ خداست — اصلش از ہنگامۂ قالوا بلیٰ ست (۶)
از اجل ایں قوم بے پرواستے — استوار از نحن نزّلنا ستے (۷)
ذکر قائم از قیامِ ذاکر است — از دوامِ او دوامِ ذاکر است
تا خدا ان یطفئوا فرمودہ است (۸) — از فسردن ایں چراغ آسودہ است

یعنی فرد مشتِ خاک سے وجود میں آتا ہے مگر ملت کو ایک صاحبِ دل، تخلیق کرتا ہے۔ فرد کی حیات ۶۰ یا ۷۰ سال ہے مگر قوم کے لئے ۱۰۰ سال ایک سانس سے زیادہ نہیں فرد جسم و روح کے تعلق سے عبارت ہے مگر قوم ناموسِ قدیم کی حفاظت سے زندہ رہتی ہے۔ فرد طبعی عمر کو پہنچ کر مرجاتا ہے مگر قوم اپنے مقصدِ حیات کو ترک کرنے سے نابود ہو جاتی ہے۔ قوم کے لئے بھی گو فرد کی طرح مدتِ حیات معین ہے مگر اسلامی ملّتِ حُرجو ازل سے آیتِ الٰہی

رہی، اس قاعدۂ کلی سے مستثنیٰ ہے کیونکہ وہ قرآن مجید کی حامل ہے جس کی حفاظت موعود من اللہ ہے۔ خدا نے چونکہ قرآن حکیم کی ابدی حفاظت کا وعدہ فرمادیا، لہٰذا ملت اسلامیہ بھی بہر طور ابدی رہے گی۔

مندرجہ بالا اشعار میں دو نکتے بالخصوص قابل توجہ ہیں۔ ایک یہ کہ مقصدِ حیات سے غافل قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے اور دوسرے یہ کہ کوئی صاحب دل شخص قوم کو وجود میں لاتا ہے اقبال نے جاوید نامہ میں یہی فرمایا ہے کہ انبیا و رسل کی ایک شناخت یہ ہے کہ وہ صالح اقوام کو وجود میں لے آتے ہیں:

گفت اقوام و ملل آیاتِ اوست | مصر ہائے ما ز مخلوقاتِ اوست
رحمت حق صحبت احرار او | قہر یزداں ضربتِ کرارِ او
گرچہ باشی عقل کل از وے مرم | زانکہ او بیند تن و جان را بہم

صاحب دل اور درد مند شخص کی بے قدری بھی قوم کو زوال اور انحطاط سے ہم کنار کر دیتی ہے۔ اقبال نے رومی کا یہ معروف شعر تائید کے لئے نقل کیا ہے:

تا دل صاحبدلے نامد بدرد | ہیچ قومے را خدا رسوا نکرد (۹)

نظریۂ حیات سے غافل قوم کا مٹنا کسی توجیہ و تفسیر کا محتاج نہیں۔ اس ضمن میں بھی اقبال نے مثنوی رومی کا مندرجہ ذیل شعر دو بار تضمین کیا ہے: (۱۰)

ہر ہلاکِ امّتِ پیشیں کہ بود | زانکہ برجندل گمان بردند عود

یعنی ہر امّت گزشتہ کی تباہی اس لئے ہوئی کہ اس کے افراد پتھر کو عود (خوشبودار لکڑی) سمجھنے لگے تھے۔ ان تمہیدی اشارات سے واضح ہو جاتا ہے کہ عروج و زوال امم فکر اقبال کے نہایت اہم امور میں سے ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کے نزدیک عروجِ ملت اسلامیہ کے اسباب کیا تھے

اور زوال کے کیا اور دوبارہ احیائے مسلین کے لئے وہ کیا تجاویز رکھتے تھے ۔

عروج و ترقی کا شاندار دور

اس دور کے بارے میں دیگر زعمائے ملت کی طرح، اقبال کا تبصرہ یہ ہے کہ جذبۂ ایمان کی پختگی عقائد کے قال کے بجائے حال بننے اور اتحاد و ایمانِ کامل نے مسلمانوں کو بامِ عروج پر پہنچا دیا تھا وہ قرآن و سنت کے متمسک تھے اس لئے خدائے تعالیٰ نے اپنے وعدے کے بموجب انہیں ہر قسم کے توفیق و کامرانی سے نوازا تھا۔ دوسرے الفاظ میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کی ہمہ گیر ترقی کا ضامن ان کا دین تھا۔ یہی دین جس نے بقول اقبال[11] ہر مشکل وقت میں مسلمانوں کی مدد کی ہے۔ یہ صاحب ہنگامہ و انقلاب دین ہے:

گر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب　　دین بندۂ مومن کے لئے موت ہے یا خواب

اے وادیٔ لولاب[12]

یہاں اسلام کے شاندار ماضی کی ساری فتوحات اور کامرانیاں گنوائی نہیں جا سکتیں البتہ اشعارِ اقبال کے ذریعے مسلمانوں کے دورِ عروج اور عصرِ زوال کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے:

کون ہے تارکِ آئینِ رسولِ مختار　　مصلحت وقت کی ہے کس کے عمل کا معیار

کس کی آنکھوں میں سمایا ہے شعارِ اغیار　　ہو گئی کس کی نگہ طرزِ سلف سے بیزار

قلب میں سوز نہیں، روح میں احساس نہیں　　کچھ بھی پیغامِ محمدؐ کا تمہیں پاس نہیں

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے　　تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟

حیدریؓ فقر ہے، نے دولتِ عثمانیؓ ہے　　تم کو اسلاف سے کیا نسبتِ روحانی ہے؟

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر　　اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

خودکشی شیوہ تمہارا، وہ غیور و خوددار
تم اخوت سے گریزاں، وہ اخوت پہ نثار

تم ہو گفتار سراپا، وہ سراپا کردار
تم ترستے ہو کلی کو، وہ گلستاں بکنار

اب تلک یاد ہے قوموں کو حکایت ان کی
نقش ہے صفحۂ ہستی پہ صداقت ان کی

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش، خلافت ہے جہانگیر تری

ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

اسباب زوال

جواب شکوہ کے مندرجہ بالا بند بعض اسباب زوال کے متضمن ہیں جیسے غیر مسلموں کی تقلید، ترک قرآن، تفرقہ و بے نظمی اور حضرت رسول اکرمؐ کے ساتھ محبت کا فقدان۔ یہ سارے اسباب دراصل ترکِ قرآن کے سببِ واحد میں مجتمع ہیں۔ اقبال اس لئے فرماتے ہیں کہ تارکین قرآن سے کسی خیر و خوبی کی توقع نہیں۔ ان میں مستی و سرور آسکتا ہے نہ وہ ذوق طلب سے بہرہ مند ہو سکتے ہیں :

آنکہ بود اللہ او را ساز و برگ
فتنۂ او حبّ مال و ترسِ مرگ

رفت ازو آں مستی و ذوق و سرور
دین او اندر کتاب و او بگور

سینہ ہا از گرمیٔ قرآں تہی
از چنیں مردان چہ امید بہی؟

ہر کسے بر جادۂ خود تند رو
ناقۂ ما بے زمام و ہرزہ دَو

صاحبِ قرآن و بے ذوق طلب
العجب، ثم العجب، ثم العجب[۱۳]

امت مسلمہ کی معاصرانہ پسماندگی، غلامی، علمی اور معاشرتی تقلید اور معاشی بے سروسامانی پر اقبال نے بہت لکھا ہے مگر اسبابِ زوال میں وہ نظام ملوکیت، مذہبی پیشوائیت

عدم اتحاد اور سود خواری وغیرہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جاوید نامہ میں ہے :

از ملوکیت جہانِ تو خراب　　تیرہ شب در آستینِ آفتاب
دانش افرنگیاں غارت گری　　دیرہا خیبر شد از بے حیدری
آنکہ گوید لا الٰہ بیچارہ ایست　　فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست
چار مرگ اندر پے ایں دیر میر　　سود خوار و والی و ملا و پیر

مسلمانوں کی فکری بے مرکزی اور ان کا افتراق توحید و رسالت کے تقاضے پیش نظر نہ رکھنے سے ہوا ہے۔ اقبال کے نزدیک عقائد وحدتِ افکار کے علاوہ وحدتِ اعمال کے بھی مظہر ہونے ضروری ہیں[۱۴]۔ لہٰذا ایک خدا، ایک رسولؐ، ایک کتاب اور ایک حرم کو ماننے والوں کا افتراق و پراگندگی افسوسناک اور باعث ننگ ہے :

منفعت ایک ہے اس قوم کی نقصان بھی ایک　　ایک ہی سب کا نبیؐ، دین بھی، ایمان بھی ایک
حرم پاک بھی، اللہ بھی، قرآن بھی ایک　　کچھ بڑی بات تھی ہوتے جو مسلمان بھی ایک
فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں　　کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں ؟

سود خواری نے مسلمانوں کی کمر توڑ کے رکھ دی تھی۔ مذہبی پیشوائیت صوفیہ اور ملاؤں کی صورت میں مشہور رہی ہے۔ دورِ انحطاط کے صوفی و ملاّ نے اس انحطاط میں اضافہ ہی کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال نے اپنی زندگی کے آخری عشرے کی تصانیف میں اس گروہ پر گہرے انتقادات لکھے ہیں مثلاً :

صوفی کی طریقت میں فقط مستی احوال　　ملاّ کی شریعت میں فقط مستی گفتار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو　　ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار
مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں　　بہانہ بے عملی کا بنی شراب الست

فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور
کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست
گریز کشمکشِ زندگی سے مردوں کی
اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست! (۱۵)

ملوکیت و آمریت صرف نظامِ شاہی کا نام نہیں۔ ہر استبداد اور استحصال کا طریقہ ملوکیت کی ہی ایک قسم ہے :

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر و سلطان پر نہیں ہے منحصر
مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطان غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر (۱۶)

اقبال نے اس موضوع پر نظم اور نثر دونوں میں کافی لکھا ہے کہ اسلام میں نظامِ ملوکیت کی کوئی گنجائش نہیں (۱۷)۔ ملوک و سلاطین نے اسلامی ثقافت و مدنیت کو بے حد نقصان پہنچایا اور غیر قرآنی نظامِ زندگی کو متداول کرتے رہے ہیں :

تا نہالِ سلطنت قوت گرفت
دینِ او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر
عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر
ہم ملوکیت بدن را فربہی است
سینۂ بے نور او از دل تہی است
مثلِ زنبورے کہ بر گل می چرد
برگ را بگذارد و شہدش برد
شاخ و برگ و رنگ و بوئے او ہمان
بر جمالش نالۂ بلبل ہمان
از طلسم رنگ و بوئے او گذر
ترک صورت گوئے و در معنی نگر
مرگِ باطن گرچہ دیدن مشکل است
گل مخوان او را کہ در معنی گِل است

(جاوید نامہ)

دیگر اسباب

تن آسانی و کاہلی، اجتماعی ذمہ داری سے روگردانی اور غلط تصورِ تقدیر وہ سرگانہ دیگر اسباب

زوال ہیں جنہیں اقبال بار بار یاد دلاتے رہے ہیں۔ سخت کوشی اقوام بھی کچھ عرصہ بعد تن آسان و کاہل بن جاتی ہیں اور اس طرح ان کی باطنی قوت ٹوٹنے لگتی ہے۔ اقبال عثمانی اور ہندی (مغل) تیموریوں کی مثال دیتے ہیں۔ پہلے گروہ میں اب بھی جانِ حیات ہے مگر دوسرا گروہ حمیت اور سخت کوشی سے محروم ہو گیا ہے:

مگر یہ راز آخر کھل گیا سارے زمانے پر ... حمیت نام ہے جس کا گئی تیمور کے گھر سے[۱۸]

درفشِ ملّتِ عثمانیاں دوبارہ بلند ... چہ گویمت کہ بہ تیموریاں چہ افتاد است[۱۹]

کوئی تقدیر کی منطق سمجھ سکتا نہیں ورنہ ... نہ تھے ترکانِ عثمانی سے کم ترکانِ تیموری

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیرِ امم کیا ہے! ... شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر[۲۰]

اقبال فرماتے ہیں کہ تقدیراتِ ازلی افراد کے گناہوں کو معاف کر دیتی ہیں مگر اقوام و ملل کی تقصیریں ناقابل معافی ہیں۔ لہٰذا قومی و ملّی فیصلے سوچ سمجھ کر کرنے چاہئیں:

نااہل کو حاصل ہے کبھی قوت و جبروت ... ہے خوار زمانے میں کبھی جوہر ذاتی

شاید کوئی عمل ہو نہاں اس کے عمل میں ... تقدیر نہیں تابع منطق نظر آتی

ہاں ایک حقیقت ہے کہ معلوم ہے سب کو ... تاریخ امم جس کو نہیں ہم سے چھپاتی

ہر لحظہ ہے قوموں کے عمل پر نظر اس کی ... بُرّاں صفتِ تیغِ دو پیکر نظر اس کی

اس کی تقدیر میں محکومی و مظلومی ہے ... قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے ... کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف[۲۱]

تقدیر کے تصور کے بارے میں بحثیں بے حد و حساب ہیں۔ اقبال کو اس بات سے اتفاق ہے کہ انسان جزواً آزاد ہے اور جزواً مجبور و پابند:

چہ گویم از چگون و بے چگونش ... بروں مجبور و مختار اندرونش

چنیں فرمودۂ سلطانِ بدر است　　　　که ایمان درمیان جبر و قدر است[۲۲]

مگر ان کے نزدیک اطاعتِ خداوندی کے ذریعے مجبوری، مختاری میں بدلتی رہتی ہے اور تقدیروں کی تجدید ہوتی رہتی ہے۔ جس طرح قوم کے بدلنے سے اس کی تقدیر بدل جاتی ہے، اسی طرح ہر فرد بھی اپنی سرنوشت بدل سکتا اور اسے بہتر بنا سکتا ہے۔ پیامِ مشرق کے دیباچے میں حضرت علامہ نے لکھا ہے:

مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے۔ مگر اقوام مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہیئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے ان اللہ لایغیّر ما بقوم حتّی یغیّروا ما بانفسھم[۲۳] کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے .....‘‘

اقبال اسی مناسبت سے جاوید نامہ میں فرماتے ہیں کہ انسانی نفوس کے بدلنے سے ان کی تقدیریں بدل جاتی ہیں۔ خدائے فیاض کے ہاں تقدیروں کی کمی نہیں وہ بربنائے تقاضا تقدیریں بدل دیتا ہے اقبال شبلی نعمانی کی طرح[۲۴] صحابہ کرامؓ کی زندگیوں سے استشہاد کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو مجبور جان کر ہاتھ پاؤں توڑ کر کیوں نہ بیٹھ گئے؟ حضرت خالدؓ بن ولید کی جنگوں پر ایک نظر ڈالو کہ انہوں نے کبھی شکست نہ کھائی:

تو اگر تقدیر نو خواہی رواست　　　　زانکہ تقدیرات حق لاانتہاست
شبنمی؟ افتندگی تقدیر تست　　　　قلزمی؟ پائندگی تقدیر تست
نوع دیگر بین جہان دیگر شود　　　　این زمین و آسمان دیگر شود

ہر کہ از تقدیر دارد ساز و برگ | لرزد از نیروئے او ابلیس و مرگ
جبرِ خالدؓ عالمے برہم زند | جبر ما بیخ و بنِ ما بر کند
کار مردان است تسلیم و رضا | بر ضعیفان راست ناید ایں قبا
مرد مومن با خدا دارد نیاز | با تو ما سازیم، تو با ما بساز
عزم او خلّاقِ تقدیر حق است | روز ہیجا تیرِ او تیر حق است

(جاوید نامہ)

اقبال قناعت اور توکل کے غلط معانی اور تقدیر پرستی کو مسلمانوں کے دورِ زوال سے مربوط بناتے ہیں:

اسی قرآن میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم | جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز | تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا | کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

(ضربِ کلیم)

علاجِ زوال

احیائے اسلام و مسلمین کی خاطر سیاسی تحریکوں اور مادی وسائل کی فراہمی کی اہمیت مسلم ہے اور مصورِ پاکستان علامہ اقبال خود بھی ۱۹۰۹ء سے تا مرگ کوئی ۳۰ سال تک برِصغیر یا عالم اسلام وغیرہ کے حوالے سے اس سلسلے میں رہنمائی کرتے رہے ہیں۔ مگر ان کے نزدیک علاجِ زوال کا نسخہ مادی ہی نہیں، معنوی بھی ہے:

وہی دیرینہ بیماری وہی نامحکمی دل کی | علاج اس کا وہی آبِ نشاط انگیز ہے ساقی

اقبال فرماتے ہیں کہ دعویٰ ایمان کے باوجود موجودہ مسلمانوں کو خدا اور رسولؐ کے ساتھ تجدید

عہد و پیمان کی ضرورت ہے الا ماشاء اللہ :

رمز سوز آموز از پروانہ | در شرر آباد کن کاشانہ
طرحِ عشق انداز جانِ خویش | تازہ کن با مصطفیٰ پیمانِ خویش
زانکہ تو محبوبِ یارِ ماستی | ہمچو دل اندر کنارِ ماستی (۲۵)

اقبال فرماتے ہیں کہ مسلمان متحد ہوں، اسلام کے ساتھ عملاً متمسک ہوں، غیروں کی ریشہ دوانیوں پہ نظر رکھ کر چوکنا ہوں اور امید و یقین کا دامن مضبوطی سے تھامے ہوں تو دنیا کی کوئی طاقت انہیں گزند نہیں پہنچا سکتی :

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو | ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے | نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و بو مٹ جائے گا | ترک خرگاہی ہو یا اعرابیٔ والا گہر (۲۶)

فریاد ز افرنگ و دلآویزیٔ افرنگ | فریاد ز شیرینی و پرویزیٔ افرنگ
عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیٔ افرنگ | معمارِ حرم، باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، از خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز (۲۷)

دین ہو فلسفہ ہو، فقر ہو، سلطانی ہو | ہوتے ہیں پختہ عقائد کی بنا پر تعمیر
حرف اس قوم کا بے سوز، عمل زار و زبوں | ہو گیا پختہ عقائد سے تہی جس کا ضمیر (۲۸)

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا | تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے ۔۔۔ یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے
غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں ۔۔۔ جو ہو ذوقِ یقیں پیدا، تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم ۔۔۔ جہادِ زندگانی میں ہیں، یہ مردوں کی شمشیریں (۲۹)

عروجِ ملت کے لئے اقبال نے جوشِ کردار، جدتِ فکر و عمل اور حرکی نظامِ تعلیم وغیرہم کے سے کئی نسخے تجویز کئے ہیں مگر اہم ترین بات دینِ اسلام کو بتمامہٖ اپنانے کی ہے۔ اس کامل دین نے زندگی کی جملہ شئون کو مرتب اور منظم صورت میں محیط کر رکھا ہے۔ اگر کوئی نام نہاد مسلمان قوم اسلام سے روگرداں ہو، تو جلد یا بدیر اس کا مٹ جانا یقینی ہے۔ اقوام کے تغیر و تبدل کا کام اللہ تعالیٰ کے ہاں ایک اصول کے طور پہ نافذ رہا ہے۔(۳۰) اقبال تارکِ قرآن مسلمانوں کے مستقبل سے مایوس ہیں۔ وہ انہیں ان کی ذمہ داریاں یاد دلاتے ہیں اور خدا کے اجتماعی تعزیراتی قوانین بھی جاوید نامہ اور ارمغانِ حجاز کے چند اشعار پہ ان اشارات کو ختم کیا جاتا ہے :

بندۂ مومن ز قرآں برنخورد ۔۔۔ در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ دُرد
ملتے می خواہد ایں دنیائے پیر ۔۔۔ آنکہ باشد ہم بشیر و ہم نذیر
محفلِ ما بے مے و بے ساقی است ۔۔۔ سازِ قرآں را نواہا باقی است
زخمۂ ما بے اثر افتد اگر ۔۔۔ آسماں دارد ہزاراں زخمہ ور
ذکرِ حق از امتاں آمد غنی ۔۔۔ از زمان و از مکاں آمد غنی
حق اگر از پیشِ ما بردارَدش ۔۔۔ پیشِ قومے دیگرے بگذاردش
مسلماں فاقہ مست و ژندہ پوش است ۔۔۔ ز کارش جبرئیلؑ اندر خروش است
بیا نقشِ دگر ملت بریزیم ۔۔۔ کہ ایں ملت جہاں را بار دوش است
دگر ملت کہ کارے پیش گیرد ۔۔۔ دگر ملت کہ نوش از نیش گیرد

نگردد با یکے عالم رضامند — دو عالم را بدوشش خویش گیرد
دگر قومے کہ ذکر لا الٰہش — برآرد از دل شب صبحگاہش
شناسد منزلش را آفتابے — کہ ریگ کہکشان روید ز راہش

آزاد ترجمہ:

نام نہاد مسلمانوں نے قرآن مجید سے استفادہ نہ کیا۔ ان کے پیالے میں شراب دیکھی جا سکتی ہے نہ تلچھٹ۔ اس بوڑھے عالم کو اب ایسی ملت کی ضرورت ہے جو لشیر بھی ہو اور نذیر بھی ہم مسلمانوں کی محفل مے و ساقی سے محروم ہے البتہ سازِ قرآن کو ابدی صدائیں موجود ہیں اس مقدس ساز کے لئے ہمارا زخمہ کام نہ کرے تو فلک کے پاس دیگر مضراب بجانے والے موجود ہیں۔ کتاب خدا قوموں کی محتاج ہے نہ زمان و مکان کی۔ خدا اس کتاب عظیم کو ہمارے درمیان سے اٹھالے تو اسے کسی دوسری قوم کو دے دے گا (جو اس کے شایانِ شان ہو) ......

مسلمان فاقوں پہ قانع اور پھٹے پرانے کپڑوں پہ خوش ہے مگر اس کے کرتوتوں پہ حضرت جبرئیلؑ بھی فریاد کن ہیں۔ آئیے ایک دوسری امت عالم وجود میں لے آئیں کہ موجودہ ملتِ اسلامیہ تو عالم کے لئے بار دوش بنی ہوئی ہے۔ نئی امت ایسی ہو جو کچھ کر دکھائے اور خوب و بد میں امتیاز کر سکے۔ وہ ایسی ملت ہو جو ایک نہیں دو دو جہانوں کی ذمہ داری قبول کر سکے ایسی ملت اسلامیہ جو ذکر توحید سے تاریکی شب کو نور صبح میں بدل سکے۔ اس ملت اسلامیہ کی تابانیاں نیرِ عالمتاب کی روشنی پہ غالب آجائیں گی۔

حوالہ جات

۱۔ بانگ درا حصہ دوم، پیام عشق۔

۲۔ ایضاً حصہ سوم، خطاب بہ جوانانِ اسلام

۳۔ ایضاً، مسلم

۴۔ ایضاً طلوعِ اسلام

۵۔ اشارہ بہ قرآن مجید آیہ ۳۴، سورہ ۷

۶۔ ایضاً ۱۷۲ : ۷

۷۔ ایضاً ۹ : ۱۵

۸۔ ایضاً ۳۲ : ۸

۹۔ بالِ جبرئیل، نظم پیر و مرید

۱۰۔ ایضاً اور پیام مشرق، پیشکش

۱۱۔ دیکھیں ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کے خطبۂ الہ آباد کا آخری حصّہ

۱۲۔ ملازادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض (۱۰) ارمغان حجاز

۱۳۔ جاوید نامہ، سخنے بانژادِ نو

۱۴۔ دیکھیں قطعہ توحید (ضرب کلیم)

۱۵۔ ضرب کلیم۔ قطعات مستیٔ کردار اور شکست بالترتیب۔

۱۶۔ نظم ابلیس کی مجلس شوریٰ، ارمغان حجاز

۱۷۔ دیکھیں احمدیوں اور قادیانیوں کے سلسلے میں پنڈت جواہر لعل نہرو کے مضمون کا جواب اقبالؒ

۱۸۔ بانگِ درا، نظم غلام قادر رہیلہ

۱۹۔ مثنوی مسافر

۲۰۔ بالِ جبریل

۲۱۔ ضربِ کلیم

۲۲۔ زبورِ عجم، گلشنِ رازِ جدید جواب سوال ۸

۲۳۔ قرآن مجید ۱۳ : ۱۱

۲۴۔ دیکھیں میری کتاب برکاتِ اقبال میں مقالہ اقبال اور شبلی مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۸۴ء
صفحہ ۲۳۸

۲۵۔ مثنوی رموزِ بیخودی پیشکش

۲۶۔ بانگِ درا ، خضرِ راہ

۲۷۔ زبورِ عجم

۲۸۔ ضربِ کلیم

۲۹۔ بانگِ درا ، طلوعِ اسلام

۳۰۔ قرآن مجید ۲۰ : ۱۴